کچھ دور جا کر اس نے سوچا۔ ایک بار پھر رتن کے پاس چلوں۔ وہ جب اس کے بنگلے پر پہنچا تو وہ اپنے باغیچہ میں چبوترے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے پاس ہی ایک گھرتی جوہری بیٹھا ہوا تھا۔ صندوق سے گہنے نکال نکال کر دکھا رہا تھا۔ رما کو دیکھ کر وہ بہت ہی خوش ہوئی۔

''بابو جی دیکھئے سیٹھ جی کیسی اچھی اچھی چیزیں لائے ہیں۔ اس ہار کے دام بارہ سو روپے بتلاتے ہیں؟''

رما نے ہار کو ہاتھ میں لے کر دیکھا اور کہا۔ ''ہاں چیز تو اچھی معلوم ہوتی ہے۔''

رتن: ''دام بہت کہتے ہیں۔''

جوہری: ''بائی جی ایسا ہار اگر کوئی دو ہزار میں لا دے تو جو جرمانہ کہیے دوں۔ میں نے تو لاگت بتلائی ہے۔''

رما نے مسکرا کر کہا۔ ''ایسا نہ کہیے سیٹھ جی جرمانہ دینا پڑے گا۔''

جوہری: ''نہ بابو صاحب! ہار تو سو روپیہ میں آ جائے گا اور بالکل ایسا ہی۔ بلکہ چمک دمک میں اس سے بڑھ کر۔ مگر مال پڑکھنا چاہیے۔ میں نے خود ہی آپ سے مول تول کی بات نہیں کی۔ مول تول اناڑیوں سے کیا جاتا ہے۔ آپ سے کیا مول تول۔ ہم لوگ نرے روزگاری نہیں ہیں بابو صاحب، آدمی کا مزاج پایا ہے کہ واہ۔''

رتن نے ہار کو للچائی ہوئی نگاہ سے دیکھ کر کہا۔ ''کچھ تو کم کیجیے سیٹھ جی۔ آپ نے تو جیسے قسم کھائی ہے۔''

رتن: ''اچھا تو ایک بات بتلا دیجیے، کم سے کم آپ اس کا کیا لیں گے؟''

جوہری نے کچھ رنجیدہ ہو کر کہا۔ ''بارہ سو روپے اور بارہ کوڑیاں ہوں گی۔ حضور اسی شہر میں پندرہ سو کی بیچوں گا اور آپ سے کہہ جاؤں گا کس نے لیا۔''

جوہری نے ہار رکھنے کے لیے کیس نکالا۔ رتن کو یقین آ گیا کہ یہ کچھ کم نہ کرے گا۔ بچوں کی طرح بے صبر ہو کر بولی۔ ''آپ تو ایسا سمیٹے لیتے ہیں۔ گویا ہار کو نظر لگ جائے گی۔''

جوہری: ''کیا کروں صاحب۔ جب ایسے دربار میں چیز کی قدر نہیں ہوتی تو رنج ہوتا ہے۔''

رتن نے کمرے میں جا کر رما کو بلایا اور بولی۔ ''آپ کے خیال میں یہ کچھ اور نیچے اترے گا؟''

رما: ''میرے خیال میں تو یہ چیز ایک ہزار سے زیادہ کی نہیں ہے۔''

رتن: ''اونہہ ہو گا۔ میرے پاس تو چھ سو روپے ہیں۔ آپ چار سو روپے کا انتظام کر دیں تو لے لوں۔ یہ اسی گاڑی سے کاشی جا رہا ہے۔ ادھار نہ مانے گا۔ وکیل صاحب کسی جلسے میں گئے ہوئے ہیں، نو دس بجے سے پہلے نہ لوٹیں گے۔ میں آپ کو کل روپیہ لوٹا دوں گی۔''

رما نے بے بسی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''یقین مانیے میں اس وقت بالکل خالی ہاتھ ہوں۔ میں تو آپ سے روپے مانگنے آیا تھا، وہ روپے مجھے دے دیجیے۔ میں آپ کے لیے یہیں سے کوئی اچھا سا ہار لا دوں گا۔ سات آٹھ سو سے زیادہ نہ لگیں گے۔''

رتن: ''چلیے میں آپ کی باتوں میں نہیں آتی۔ چھ مہینے میں ایک کنگن کا جوڑا تو

بنوا نہ سکے، اب ہار کیا لائے گا۔ میں یہاں کئی دکانیں دیکھ چکی ہوں۔ ایسی چیز شاید ہی کہیں نکلے اور نکلے گی بھی تو اس کے ڈیوڑھے دام دینے پڑیں گے۔''

رما: ''تو اسے کل کیوں نہ بلائیے۔ سودا بیچنے کی غرض ہو گی۔ تو آپ ٹھہرے گا۔''

رتن: ''اچھا۔ کہیے، دیکھئے کیا کہتا ہے؟''

دونوں کمرے سے باہر نکلے۔ رما نے جوہری سے کہا۔ ''تم کل آٹھ بجے کیوں نہیں آتے؟''

جوہری: ''نہیں حضور! کل کاشی میں دو چار بڑے رئیسوں سے ملنا ہے۔ آج نہ جانے سے بڑا نقصان ہو جائے گا۔''

رتن: ''میرے پاس تو اس وقت چھ سو روپے ہیں۔ باقی روپے کل لینے ہوں، تو ہا رد ے دیجیے۔''

جوہری: ''روپے کی تو کوئی بات نہیں۔ مہینہ دو مہینہ میں لے لیتا، لیکن ہم پردیسیوں کا کیا ٹھکانا۔ کون جانے یہاں پھر کب آنا ہو۔ آپ اس وقت ایک ہزار دے دیں۔ دو سو پھر دے دیجیے گا۔''

دفعتاً موٹر کی آواز سن کر رتن نے پھاٹک کی طرف دیکھا۔ وکیل صاحب چلے آ رہے تھے۔ رتن نے آگے بڑھ کر کہا۔ ''آپ تو نو بجے آنے کو کہہ گئے تھے۔''

وکیل: ''وہاں کورم ہی پورا نہ ہوا۔ بیٹھ کر کیا کرتا۔ کوئی دل سے تو کام کرنا نہیں چاہتا۔ سب مفت میں نام کمانا چاہتے ہیں۔ یہ کیا کوئی جوہری ہے؟''

جوہری نے اٹھ کر سلام کیا۔

وکیل صاحب رتن سے بولے۔ ''کیوں تم نے کوئی چیز پسند کی۔''

رتن: ''ہاں ایک ہار پسند کیا ہے۔ بارہ سو مانگتے ہیں۔''

وکیل: ''بس! اور کوئی چیز پسند کرو۔''

رتن: ''اس وقت تو مجھے اور کسی چیز کی ضرورت نہیں۔''

وکیل صاحب کو رتن سے شوہر کی سی محبت نہیں۔ باپ کی سی محبت تھی، جیسے کوئی محبتی باپ لڑکیوں سے پوچھ پوچھ کر کھلونے لیتا ہے، وہ بھی رتن سے پوچھ پوچھ کر آرائش کے کھلونے لیتے تھے۔ ان کے پاس خوش کرنے کے لیے دولت کے سوا اور چیز ہی کیا تھی، انہیں اپنی زندگی میں ایک مجسم سہارے کی ضرورت تھی۔ ایک مجسم سہارے کی، جس کی قوت سے وہ اس عالم ضعیفی میں بھی کارزار ہستی میں کھڑے رہ سکیں۔ جیسے کسی بڈھے کو لاٹھی کی ضرورت ہوتی ہے یا کسی اپاسک کو مورتی کی۔ بغیر مورتی کے وہ کس پر پھول چڑھائے۔ کسے گنگا جل سے نہلائے۔ کسے لذیذ چیزوں کا بھوگ لگائے۔

رتن نے کیس میں سے ہار نکال کر دکھایا اور بولی۔ ''اس کے بارہ سو مانگے ہیں۔''

وکیل صاحب کی نگاہ میں روپے کی قیمت اس سے پیدا ہونے والی خوشی تھی۔ اگر ہار رتن کو پسند ہے تو انہیں اس کی پروا نہیں کہ اس کے کیا دینے پڑیں گے۔ انہوں نے چیک بک نکال کر جوہری کی طرف دیکھا اور پوچھا: ''سچ سچ بولو کتنا لکھوں اور اگر فرق پڑا تو تم جانو گے۔''

جوہری نے ہار کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور بولا ''ساڑھے گیارہ سو کر دیجیے۔''

وکیل صاحب نے چیک لکھ کر اس کو دیا اور وہ سلام کر کے رخصت ہوا۔

رما کچھ دیر تو بیٹھا۔ وکیل صاحب کے سیاحت یورپ کے تذکرے سنتا رہا۔ آخر مایوس ہو کر چلا آیا۔

(21)

اگر اس وقت کسی کو دنیا میں سب سے زیادہ فکرمند، مصیبت زدہ اور زندگی سے بیزار انسان کی صورت دیکھنی ہو تو اس نوجوان کو دیکھے، جو سائیکل پر بیٹھا ہوا الفریڈ پارک کے سامنے چلا آ رہا ہے۔ اس وقت اگر کوئی کالا سانپ نظر آئے تو وہ غالباً دونوں ہاتھ پھیلا کر اسے گلے سے لگائے گا اور اس کے زہر کو امرت کی طرح پئے گا۔ اس کی نجات اب امرت میں نہیں، زہر ہی میں ہے۔ موت ہی اب اس کی فکروں کا خاتمہ کر سکتی ہے، لیکن کیا موت اسے زندگی سے بھی بچا سکتی ہے۔

اگر رما نا تھا اس وقت بھی جا کر جالپا سے سارا واقعہ بے کم و کاست کہہ سناتا، تو وہ اس کے ساتھ ضرور ہمدردی کرتی۔ یقیناً وہ اپنے سارے زیور اس کے سپرد کر دیتی۔ ان زیوروں کو گروی رکھ کر سرکاری روپے ادا کر دیتا۔

دل میں یہی فیصلہ کر کے رما گھر کی طرف چلا، لیکن گھر پہنچ کر اس نے سوچا جب یہی کرنا ہے تو جلدی کیا ہے، جب چاہوں گا مانگ لوں گا۔ کچھ دیر گپ شپ کرتا رہا۔ تب کھانا کھا کر لیٹا۔ دفعتاً اس کے جی میں آیا کیوں نہ چپکے سے کوئی چیز اٹھا کر لے جاؤں۔ خاندانی وقار کی حفاظت کرنے کے لیے اس نے ایک بار یہ چال چلی تھی۔ اس نسخہ سے کیا وہ اپنی جان کی حفاظت نہیں کر سکتا۔ اپنی زبان سے تو شاید وہ کبھی اپنا پردہ فاش نہیں کر سکتا۔ اسی طرح شش و پنج میں پڑے سویرا ہو

جائے گا اور تب اسے کچھ کہنے کا موقع نہ ملے گا۔

مگر اندیشہ ہوا کہ کہیں جالپا کی آنکھ نہ کھل جائے۔ پھر تو وہ اس کے لیے ترجینی کے سوا اور کوئی جگہ ہی نہ رہے گی۔ جو کچھ بھی ہو، ایک بار کوشش کرنا شرط ہے۔ اس نے آہستہ آہستہ جالپا کا ہاتھ اپنے سینے پر سے ہٹایا اور چارپائی سے اتر کر فرش پر کھڑا ہو گیا۔ اسے ایسا شبہ ہوا کہ جالپا ہاتھ اٹھاتے ہی چونکی، لیکن پھر معلوم ہوا یہ محض شبہ تھا۔ اب اسے جالپا کی جیب سے چابیوں کا گچھا نکالنا تھا۔ دیر کرنے کا موقع نہ تھا، لیکن نیند میں بھی حواس ثانی قائم رہتے ہیں۔ بچہ کتنا ہی غافل سویا ہوا ہو، ماں کے چارپائی سے اٹھتے ہی جاگ پڑتا ہے۔ جب وہ چابی نکالنے کے لیے جھکا تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ جالپا مسکرا رہی ہے۔ اس نے فوراً ہاتھ کھینچ لیا اور لیمپ کی روشنی میں جالپا کے منہ کی طرف تاکنے لگا۔

جالپا کا رہ رہ کر مسکرانا بتلا رہا تھا کہ وہ کوئی دلآویز خواب دیکھ رہی ہے۔ اس تبسم نے گویا رما کے دل کو منور کر دیا۔ اس محبت اور وفا کی دیوی کے ساتھ وہ کتنا کمینہ پن کر رہا ہے۔ جس وقت اسے معلوم ہوگا کہ اس کے گہنے چوری ہو گئے تو اس کی کیا حالت ہوگی۔ وہ کن انکھیوں سے اسے چھاتی پیٹتے اور سر کے بال نوچتے دیکھے گا۔

وہ پھر چارپائی پر لیٹ رہا۔ اسی وقت جالپا کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس کے منہ کی طرف دیکھ کر بولی:

''تم کہاں گئے تھے؟ میں بڑا اچھا خواب دیکھ رہی تھی۔ ایک سہانا باغ ہے، ہم تم دونوں اس میں ٹہل رہے ہیں۔ اتنے میں تم نہ جانے کہاں جاتے ہو اور ایک

سادھو آ کر میرے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس کی صورت بالکل دیوتاؤں جیسی ہے۔ وہ مجھ سے کہتا ہے، بیٹی! میں تم سے بہت خوش ہوں۔ مجھ سے جو چاہے مانگ لے۔ میں تمہیں ادھر ادھر ڈھونڈ رہی ہوں کہ تم سے پوچھ کر کچھ مانگوں۔ پر تم کہیں دکھائی نہیں دیتے۔ میں سارا باغ چھان آئی۔ درختوں کی آڑ میں دیکھا، تم نہ جانے کہاں چلے گئے ہو۔ بس اتنے میں نیند کھل گی، کچھ مانگنے نہ پائی۔''

رما نے مسکرا کر کہا ''کیا مانگتیں؟''

جالپا: ''مانگتی، جو جی میں آتا تمہیں کیوں بتاؤں؟''

رما: ''میں سمجھ گیا، تم بہت سی دولت مانگتیں۔''

جالپا: ''دولت کو تو تم بہت بڑی چیز سمجھتے ہو گے، میں تو کچھ نہیں سمجھتی۔''

رما: ''ہاں میں تو سمجھتا ہوں۔ مطمئن رہ کر جینا مرنے سے بھی بدتر ہے۔ میں تو اگر کسی دیوتا کو پکڑ پاؤں تو بغیر کافی روپے لیے نہ چھوڑوں۔ میں سونے کی دیوار نہیں کھڑی کرنا چاہتا۔ راک فیلر اور کارنیگی بننے کی مجھے ہوس نہیں ہے۔ صرف اتنی دولت چاہتا ہوں کہ روزمرہ کی ضرورتوں کے لیے ترسنا نہ پڑے۔

بس کوئی دیوتا مجھے پانچ لاکھ روپے دے دے تو میں پھر اس سے کچھ نہ مانگوں گا۔ ہمارے غریب ملک میں ایسے کتنے ہی رئیس ہیں، جو پانچ لاکھ سالانہ خرچ کرتے ہیں۔ میں تو اتنے میں ساری عمر کی غلامی لکھنے کو تیار ہوں، مگر مجھے کوئی اتنا بھی نہیں دیتا۔''

جالپا: ''تو پھر تم کیا مانگتیں؟ اچھے اچھے گہنے؟''

جالپا نے ملامت آمیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ ''کیوں چڑاتے ہو مجھے؟ کیا

میں گہنوں پر اور عورتوں سے زیادہ جان دیتی ہوں؟ میں نے تو کبھی تم سے ضد نہیں کی۔ تمہیں ضرورت ہو آج اٹھا کر لے جاؤ۔ مجھے مطلق ملال نہ ہوگا۔''

رما نے جھینپ مٹاتے ہوئے کہا۔ ''تو پھر بتلاتی کیوں نہیں؟''

جالپا نے شرماتے ہوئے کہا۔ ''میں یہی مانگی ہوں کہ تم ہمیشہ مجھ سے محبت کرتے رہو۔ تمہارا دل مجھ سے کبھی برگشتہ نہ ہو۔''

رما نے ہنس کر کہا ''اچھا تو کیا تمہیں یہ خوف بھی ہے؟''

جالپا: ''اوروں کی حالت دیکھ کر مجھے بھی کبھی یہ خوف ہونے لگتا ہے۔ مجھے تو کوئی ایسی عورت نہ ملی، جس نے اپنے شوہر کی بے مہری اور بے التفاتی کا قصہ نہ کہا ہو۔''

یہ کہتے ہوئے جالپا نے رما کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور پیار میں ڈوبی ہوئی نگاہوں سے دیکھتی ہوئی بولی:

''سچ بتانا تم اب بھی مجھے اتنا ہی چاہتے ہو، جتنا پہلے چاہتے تھے؟''

رما نے جالپا کو گلے سے لگا کر کہا۔ ''اس سے کہیں زیادہ، لاکھ گنا۔''

جالپا نے ہنس کر کہا۔ ''بالکل جھوٹ۔ سولہ آنے جھوٹ۔''

رما: ''یہ تمہاری زبردستی ہے۔ آخر یہ تمہیں کیونکر معلوم ہوا؟''

جالپا: ''کیوں میری آنکھیں نہیں ہیں۔ تم نے میرے پاس بیٹھنے کی قسم کھائی ہے۔ جب دیکھو گم صم بیٹھے رہتے ہو۔ مجھ سے محبت ہوتی تو مجھ پر اعتبار بھی ہوتا۔ جس سے تم اپنے دل کی بری سے بری بات نہ کہہ سکو۔ اس سے تمہیں محبت نہیں ہو سکتی۔ تم اس کے ساتھ زندگی کا لطف اٹھا سکتے ہو۔ عیش کر سکتے ہو۔ اسی طرح جیسے

کوئی بازاری عورتوں کے پاس جاتا ہے۔ وہاں آدمی زندگی کا لطف اٹھانے کے لیے ہی جاتا ہے۔ اپنے دل کا دکھ کہنے نہیں جاتا۔ میرے ساتھ تمہارا یہی سلوک ہے۔ بولو ہے یا نہیں؟ کیا میں دیکھتی نہیں کہ تم باہر سے کچھ پریشان آتے ہو۔ باتیں کرتے ہو، تو ایسا معلوم ہوتا ہے، دل کہیں اڑا ہوا ہے۔ کھانا بھی اسی طرح کھاتے ہو جیسے بیگار ٹالتے ہو۔ کیا میں یہ ساری باتیں نہیں دیکھتی۔ تمہارے خیال سے مجھے دیکھنا نہ چاہیے۔ تم صرف میرے حسن کے شیدا ہو۔ میرا کام ہے سیر و تفریح کرنا، آرائش میں مصروف رہنا۔ مجھے تمہاری فکروں سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ مگر کیا کروں مجھے ایشور نے وہ دل نہیں دیا ہے۔''

وہ سر جھکائے سنتا رہا۔ جالپا نے اس کی فطرت کا اتنا صحیح مطالعہ کیا ہے، اس کا اسے گمان بھی نہ تھا۔ فی الواقعہ وہ اس کے حسن کا شیدائی تھا، کبھی اس کا حسن باطن دیکھنے کی کوشش نہ کی۔

اگر اس کی صورت اتنی دلکش نہ ہوتی تو شاید وہ اس سے بولنا پسند نہ کرتا۔ اس کی ساری کشش، اس کی ساری مسرت جالپا کے حسن میں مرکوز تھی۔ وہ سمجھتا تھا مگر آج اس پر روشن ہوا کہ اس کی حسن پرستی جالپا کو آسودہ نہیں کر سکتی۔ وہ اس کی شریک درد ہونے کے لیے بےقرار ہے۔ اس وقت اسے اپنا درد کہہ ڈالنے کا اچھا موقع تھا، لیکن شرم نے پھر اس کی زبان بند کر دی۔ جو باتیں وہ اتنے دنوں سے چھپائے ہوئے تھا، وہ اب کیسے کہے؟ کیا ایسا کرنا جالپا کے الزاموں کو صحیح تسلیم کرنا نہ ہوگا۔

رما انہی خیالوں میں پڑا سو گیا۔

آدھی رات سے زیادہ گزر چکی تھی۔ سویا تو اس ارادے سے تھا کہ بہت سویرے اٹھ جاؤں گا، لیکن نیند کھلی تو کمرے میں روشنی پھیل چکی تھی۔ وہ گھبرا کر اٹھا اور بغیر ہاتھ منہ دھوئے کپڑے پہن کر رمیش بابو کے یہاں جانے کو تیار ہو گیا۔ انہیں اب محرم راز بنانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ جالپا اس وقت کھانا بنانے کی تیاریاں کر رہی تھی۔ رما کو اس طرح جاتے دیکھ کر اس کے چہرے کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

رما کے چہرے پر اضطراب اور کلفت اور خوف کی کیفیت نمایاں تھی۔ ان کی یہ کیا حالت ہے؟ اس سے وہ کچھ کہتے کیوں نہیں۔ وہ اور کچھ نہ کر سکے، ہمدردی تو کر ہی سکتی ہے۔ تسکین تو دے ہی سکتی ہے۔ اس کے جی میں آیا، رما کو پکڑ کر پوچھے کیا بات ہے؟ اٹھ کر دروازے تک آئی بھی، لیکن رما تانگہ سڑک پر دور نکل گیا تھا۔ اس نے دیکھا، وہ بڑی تیزی سے چلا جا رہا ہے، جیسے سنک گیا ہو۔ نہ داہنی طرف تاکتا ہے، نہ بائیں طرف۔ صرف سر جھکائے راہ گیروں سے ٹکراتا، تانگہ اور موٹر کی پروا نہ کرتا ہوا بھاگا ہوا چلا جا رہا تھا۔ وہ ایک محویت کے عالم میں کئی منٹ تک دروازے پر کھڑی رہی۔ پھر اندر آ کر کھانا بنانے لگی، لیکن اسی فکر میں غلطاں و پیچاں تھی کہ کیا بات ہے۔ وہ اس سے کیوں اتنا چھپاتے ہیں۔

رما، رمیش کے گھر پہنچا تو آٹھ بج گئے تھے۔ بابو صاحب چوکی پر بیٹھے سندھیا کر رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ کوئی آدھ گھنٹہ بعد سندھیا سے فارغ ہو کر بولے:

''کیا ابھی تک ہاتھ منہ نہیں دھویا۔ یہی لچر پن مجھے ناپسند ہے اور کچھ نہ کرو،

جسم کی صفائی کا تو خیال رکھو۔ کیا ہوا، روپیہ کا کچھ انتظام ہوا؟''

رما نے دل پر جبر کر کے کہا۔ ''اسی فکر میں تو آپ کے پاس آیا ہوں۔''

رمیش: ''تم بھی عجیب آدمی ہو۔ آخر منشی جی سے کہتے تمہیں کیوں شرم آتی ہے۔ یہی تو ہوگا کچھ سخت سست کہیں گے، لیکن اس بلا سے تو نجات مل جائے گی۔ اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے۔ ایسے حادثے زندگی میں ہوتے رہتے ہیں۔ نہیں تو چلو میں کہے دیتا ہوں۔''

رما: ''ان سے کہنا ہوتا تو کبھی کا کہہ چکا ہوتا۔ کیا آپ کوئی بندوبست نہیں کر سکتے؟''

رمیش: ''کر کیوں نہیں سکتا، مگر کرنا نہیں چاہتا۔ ایسے آدمی کے ساتھ مجھے کوئی ہمدردی نہیں ہو سکتی، جو بات تم مجھ سے کہہ سکتے ہو، کیا ان سے نہیں کہہ سکتے۔ پہلے ان سے کہو۔ اگر روپے نہ دیں، تب میرے پاس آنا۔'' اس بے التفاتی نے رما کے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ اتنی یگانگت کے باوجود یہ بے دردی اس کے منہ سے کوئی دوسرا لفظ نہ نکلا۔ وہاں سے اٹھ کر چلا، مگر کچھ سوجھ نہ پڑتا تھا۔ چودائی میں آسمان سے گرتے ہوئے پانی کے قطروں کی جو حالت ہوتی ہے، وہی حالت اس وقت رما کی تھی۔ دس قدم تیزی سے آگے چلتا تو پھر کچھ سوچ کر رک جاتا اور دس پانچ قدم پیچھے لوٹ جاتا۔ کبھی اس گلی میں گھس جاتا، کبھی اس گلی میں۔ دفعتاً ایک ترکیب سوجھی۔ کیوں نہ جالپا کو ایک رقعہ لکھ کر سارا ماجرہ کہہ سنائے۔ زبان سے تو وہ کچھ نہ کہہ سکتا تھا، مگر قلم سے لکھنے میں اسے کوئی مشکل نہ ہوتی تھی۔ اس نے سوچا رقعہ لکھ کر جالپا کو دے دوں گا اور باہر کے کمرے میں آ بیٹھوں گا۔ زبانی

گفتگو کا موقع ہی نہ آنے دوں گا۔ وہ بھاگا ہوا گھر آیا اور فوراً رقعہ لکھا:

''جانِ من!

کیا کہوں، کس مصیبت میں گرفتار ہوں۔ اگر ایک گھنٹہ کے اندر تین سو روپے کا انتظام نہ ہو سکا تو ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑ جائیں گی۔ میں نے بہت ہاتھ پیر مارے کہ کسی سے قرض لے لوں گا، مگر کوئی صورت نہ نکلی۔ اگر تم اپنے دو ایک زیور دے دو تو میں گروی رکھ کر کام نکال لوں۔ جونہی روپے ہاتھ آ جائیں گے چھڑا دوں گا۔ اگر مجبوری نہ آ پڑتی تو تمہیں تکلیف نہ دیتا۔ ایشور کے لیے ناراض نہ ہونا۔ میں نے تم سے اب تک راز کو چھپایا، اس کا مجھے افسوس ہے۔''

ابھی یہ خط پورا نہ ہوا تھا کہ رمیش بابو مسکراتے ہوئے آ کر بیٹھ گئے اور بولے:

''کہا ان سے تم نے؟''

رما نے سر کھجا کر کہا۔ ''ابھی تو موقع ہی نہیں ملا۔''

رمیش: ''تو کیا دو چار دن میں موقع ملے گا؟ میں ڈرتا ہوں کہ آج بھی کہیں خالی ہاتھ نہ چلے جاؤ، نہیں تو غضب ہی ہو جائے۔''

رما: ''جب ایک بات دل میں طے کر لی تو اب کیا فکر؟''

رمیش: ''آج موقع ملے تو ذرا رتن کے پاس چلے جانا۔ اس دن میں نے کتنا زور دے کر کہا تھا، لیکن شاید تم بھول گئے تھے۔''

رما: ''بھول تو نہیں گیا، ان سے کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔''

رمیش: ''واہ رے آپ کی شرم۔ ذلیل تو مجھے وہ سمجھیں گی۔ تمہیں کاہے کی شرم۔ آج دفتر سے لوٹ کر ضرور چلے جانا۔ ذرا زبان ہلا دینے سے کسی غریب کا

کام نکلتا ہو تو ہمیں دریغ نہ کرنا چاہیے۔''

رمیش بابو چلے گئے تو رما نے رقعہ اٹھا کر جیب میں ڈالا اور اندر داخل ہوا۔

جالپا آج کسی سہیلی کے گھر جانے کو تیار تھی۔ تھوڑی دیر ہوئی، بلاوا آیا تھا۔ اپنی بہترین ساڑھی پہنے تھی۔ ہاتھوں میں جڑاؤ کنگن زیب دے رہے تھے۔ گلے میں چندن ہار کھلا ہوا تھا۔ آئینہ سامنے رکھ کر کانوں میں جھومک پہن رہی تھی۔ کچھ روکھے پن سے بولی:

''آج سویرے کہاں چلے گئے تھے۔ ہاتھ منہ تک نہ دھویا۔ دن بھر تو باہر رہتے ہی ہو، شام سویرے تو گھر پر رہا کرو۔ تم نہیں رہتے تو گھر سونا سونا لگتا ہے۔ میں ابھی سوچ رہی تھی، مجھے میکے جانا پڑے تو میں نہ جاؤں۔ میرا جی تو وہاں بالکل نہ لگے۔''

رما: ''تم تو کہیں جانے کو تیار بیٹھی ہو؟''

جالپا: ''سیٹھانی جی نے بلا بھیجا ہے۔ دوپہر تک چلی آؤں گی۔''

اس وقت رما کی حالت اس شکاری کی سی تھی، جو ہرنی کو اپنے بچوں کے ساتھ کلیلیں کرتے دیکھ کر تنی ہوئی بندوق اپنے کندھوں پر رکھ لیتا ہے اور مادرانہ محبت کا نظارہ دیکھنے میں محو ہو جاتا ہے۔

اسے اپنی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھ کر جالپا نے کہا:

''دیکھو مجھے نظر نہ لگا دینا۔ میں تمہاری آنکھوں سے بہت ڈرتی ہوں۔''

رما ایک ہی پرواز میں موجودات کی دنیا سے شعر اور تخیل کی دنیا میں جا پہنچا۔ ایسے موقعوں پر جب جالپا کا دل خوشی سے ناچ رہا تھا، وہ اپنا خط دے کر اس کی

مسرت ناک سرگرمیوں کو خاک میں نہیں ملائے گا۔ وہ کون سا بے رحم صیاد ہے، جو چہکتی ہوئی چڑیا کی گردن پر چھری چلا دے گا۔

وہ کون سا مردہ دل آدمی ہے، جو کسی گل نورس کو توڑ کر پیروں میں کچل دے گا۔ رما اتنا بے رحم اور مردہ دل نہیں ہے۔ وہ کتنی ہی بڑی مصیبت میں کیوں نہ گرفتار ہو جائے، اس کی کتنی ہی رسوائی ہو، اس کی زندگی ہی کیوں نہ تباہ ہو جائے، مگر وہ اتنا بے حس نہیں ہو سکتا۔ اس نے مدہوش ہو کر کہا:

''نظر تو نہ لگاؤں گا۔'' اسی ایک جملہ میں اس کی ساری پریشانیاں اور ساری مشکلیں نظر انداز ہو گئیں۔

وہ اس نادان بچے کی طرح تھا، جو پھوڑے پر نشتر کی عارضی تکلیف کو نہ برداشت کر کے اس کے پھوٹنے، ناسور پڑنے، مہینوں چارپائی پر پڑے رہنے کی تکلیف منظور کر لیتا ہے۔

جالپا نیچے جانے لگی تو رما نے فرط محبت سے اسے گلے لگا لیا اور اس طرح بھینچ بھینچ کر پیار کرنے لگا، گویا محبت کے خزانے کو آج ہی لٹا دے گا۔ کون جانتا ہے کہ یہی اس کی آخری ملاقات ہے۔

دفعتاً جالپا بولی۔ ''مجھے کچھ روپے تو دے دو۔ شاید وہاں ضرورت پڑے؟''

رما نے چونک کر کہا۔ ''روپے، روپے تو اس وقت نہیں ہیں۔''

جالپا: ''نہیں ہیں، مجھ سے بہانہ کر رہے ہو، بس مجھے دو سو روپے دے دو۔ زیادہ نہیں چاہتی۔''

یہ کہہ کر اس نے رما کی جیب میں ہاتھ ڈال دیا اور کچھ پیسوں کے ساتھ وہ رقعہ

بھی نکال لیا۔

رمانے ہاتھ بڑھا کر رقعے کو جالپا کے ہاتھ سے چھیننے کی کوشش کر کے کہا:

''یہ کاغذ مجھے دے دو سرکاری کاغذ ہے۔''

جالپا: ''کس کا خط ہے، بتا دو؟''

پھر اس نے تہہ کیے ہوئے پرزے کو کھول کر کہا:

''یہ سرکاری کاغذ ہے؟ جھوٹے کہیں کے۔ یہ تمہارا ہی لکھا.........!''

رما: ''دے دو۔''

رمانے پھر کاغذ چھین لینا چاہا، مگر جالپا نے ہاتھ پیچھے پھیر کر کہا:

''میں بغیر پڑھے نہیں دوں گی۔ زیادہ ضد کرو گے تو پھاڑ ڈالوں گی۔''

رما: ''اچھا پھاڑ ڈالو۔''

جالپا: ''تب تو میں ضرور پڑھوں گی۔''

اس نے دو قدم پیچھے ہٹ کر پرزہ کھولا اور پڑھنے لگی۔

رمانے دوبارہ اس کے ہاتھ سے رقعہ چھیننے کی کوشش نہیں کی۔ اسے ایسا معلوم ہوا، گویا آسمان پھٹ پڑا ہے اور کوئی خوفناک جانور اسے نگلنے چلا آ رہا ہے۔ وہ دھم دھم کرتے ہوئے اوپر سے اترا اور باہر چلا گیا۔

کہاں اپنا منہ چھپائے۔ کہاں روپوش ہو جائے کہ کوئی اسے دیکھ نہ سکے۔ اس کی حالت کسی برہنہ تن آدمی کی سی تھی۔ افسوس! سارا پردہ کھل گیا۔ اس کی ساری دروغ بیانیوں کا پردہ فاش ہو گیا۔ جن باتوں کو جالپا سے چھپانے کی اس نے اتنے دن کوشش کی، ایسی ایسی مصیبتیں جھیلیں، وہ آج اس کے منہ پر سیاہ داغ بن کر اس

کی تشہیر کر رہی تھیں۔ وہ اب یہاں رہ کر اپنی ذلت اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتا۔

جالپا کی سسکیاں، منشی جی کی جھڑکیاں، ہمسایوں کی چٹکیاں سننے سے مر جانا کہیں آسان تر تھا۔ جب وہ اس دنیا میں نہ رہے گا تو اسے اس کی کیا پروا ہوگی کہ کوئی اسے کیا کہہ رہا ہے۔ ہائے، محض تین سو روپوؤں کے لیے اس کا ستیا ناس ہوا جا رہا ہے۔

جالپا سے کتنا بدنیت، کتنا مکار اور کتنا فتنہ ساز سمجھ رہی ہوگی۔ کیا وہ اسے اپنا منہ دکھا سکتا ہے؟ کیا دنیا میں کوئی ایسی جگہ نہیں ہے، جہاں وہ ایک نئی زندگی کا نقشہ ڈالے۔ جہاں وہ دنیا سے الگ تھلگ سب سے منہ موڑ کر اپنی زندگی کے دن کاٹ سکے۔ جہاں وہ اس طرح چھپ جائے کہ پولیس اس کا پتا نہ پا سکے۔ گنگا کی گود کے سوا اور کہاں ہے، ایسی جگہ اگر زندہ رہا تو مہینہ دو مہینہ میں ضرور ہی پکڑ لیا جائے گا۔ اس وقت اس کی کیا حالت ہوگی۔ وہ ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنے ہوئے عدالت میں کھڑا ہوگا۔ سپاہیوں کی ایک فوج اسے گھیرے کھڑی ہوگی۔ سارے شہر کے آدمی اس کا تماشا دیکھ رہے ہوں گے۔ انہی میں جالپا بھی ہوگی۔ رتن بھی ہوگی۔ اس کے ماں باپ، عزیز و اقارب اور دوست آشنا سبھی مختلف انداز سے اس کی ذلت کا تماشا دیکھیں گے۔

نہیں..... وہ اپنی مٹی یوں خراب نہیں کرے گا.... ہرگز نہیں۔ اس سے کہیں بہتر ہے وہ ڈوب مرے۔

مگر پھر خیال آیا کہ جالپا کا کیا حشر ہوگا۔ ماں باپ تو رو دھو کر صبر کر لیں گے،

مگر اس کا دستگیر کون ہوگا؟ کیا وہ چھپ کر کہیں نہیں رہ سکتا۔ کیا شہر سے دور کسی چھوٹے گاؤں میں وہ روپوش نہیں ہوسکتا۔ ممکن ہے کبھی جالپا کو اس پر رحم آ جائے۔ اس کی خطائیں معاف کر دے۔ کیا عجب ہے کبھی اس کے دن پھریں، لیکن یہ غیر ممکن ہے کہ وہ اس کے سامنے آنکھیں سیدھی کر سکے۔ نہ جانے اس وقت جالپا کی کیا حالت ہوگی۔ شاید اس رقعہ کا مطلب سمجھ گئی ہو۔ شاید صورت کا اس نے صحیح اندازہ کر لیا ہو۔ شاید اس نے جاگیشری کو وہ رقعہ دکھایا ہو اور دونوں گھبرائی ہوئی اسے تلاش کر رہی ہوں۔ شاید منشی جی کو بلانے کے لیے لڑکوں کو بھیجا گیا ہو۔ چاروں طرف اس کی تلاش ہو رہی ہوگی۔ اسے اندیشہ ہوا کہ کہیں کوئی ادھر بھی نہ آتا ہو۔ شاید موت کو بھی سامنے دیکھ کر وہ اتنا بدحواس نہ ہوتا، جتنا کسی صورت آشنا کو دیکھ کر۔

آگے پیچھے چوکنی نگاہوں سے تاکتا ہوا وہ اس جلتی دھوپ میں چلا جا رہا تھا، کچھ خبر نہیں کہاں۔ دفعتاً ریل کی سیٹی سن کر وہ چونک پڑا۔ ارے میں اتنا دور نکل آیا۔ ریل گاڑی سامنے کھڑی تھی۔ گاڑی نے گویا زبردستی اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ جیسے اس میں بیٹھتے ہی اس کی ساری پریشانیوں کا خاتمہ ہو جائے گا، مگر جیب میں روپے نہ تھے۔ صرف انگلی میں انگوٹھی پڑی ہوئی تھی۔ اس نے قلی کو بلا کر کہا:

''کیوں بھائی یہ انگوٹھی بیچ کرا سکتے ہو؟ ایک روپیہ تمہیں دوں گا۔ مجھے گاڑی میں جانا ہے۔ گھر سے روپے لے کر چلا، لیکن معلوم ہوتا ہے کہیں گر گئے۔ روپے لینے کے لیے گھر جاؤں تو گاڑی نہ ملے گی اور بہت بڑا نقصان ہو جائے گا۔''

قلی نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ سمجھ گیا کوئی مفرور ملزم ہے۔ انگوٹھی لی

اور سٹیشن کے اندر چلا گیا۔ رما ٹکٹ گھر کے سامنے ٹہلنے لگا۔ آنکھیں اس کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ مگر دس منٹ گزر گئے قلی کا کہیں پتا نہیں۔ کہاں چلا گیا کم بخت۔ انگوٹھی لے کر، غائب تو نہ ہو جائے گا۔ سٹیشن کے اندر جا کر اسے تلاش کرنے لگا۔ گھبراہٹ میں قلی کا نمبر تک نہ دیکھا تھا۔ ادھر گاڑی چھوٹنے جا رہی تھی۔ رما سے صبر نہ ہو سکا۔ سمجھ گیا قلی نے چپکا دیا۔ بغیر ٹکٹ لیے ہوئے گاڑی میں جا بیٹھا۔ دل میں طے کر لیا، صاف کہہ دوں گا کہ میرے پاس ٹکٹ نہیں ہے۔ اگر اترنا بھی پڑا تو یہاں سے دس پانچ کوس تو چلا ہی جاؤں گا۔

گاڑی چل دی۔ اس وقت رما کو اپنی حالت پر رونا آ گیا۔ افسوس! اسے نہ جانے کبھی لوٹنا بھی نصیب ہوگا کہ نہیں۔ پھر یہ سکھ کے دن کہاں ملیں گے۔ یہ دن تو گئے ہمیشہ کے لیے۔ اسی طرح دنیا سے منہ چھپا کر وہ ایک دن مر جائے گا۔ کوئی اس کی لاش پر آنسو بہانے والا بھی نہ ہوگا۔ گھر والے بھی رو دھو کر چپ ہو رہیں گے۔ صرف تھوڑے سے شک و شبہ کی وجہ سے اس کی یہ حالت ہوئی۔ اس نے شروع ہی سے جالپا اسے اپنی سچائی اور حالت زار بتا دی ہوتی تو آج اسے اپنے منہ پر کالک مل کے نہ بھاگنا پڑتا۔ مگر کہتا کیسے؟ وہ اپنے کو بدنصیب نہ سمجھنے لگی؟ کچھ نہ سہی، کچھ دن تو اس نے جالپا کو سکھی رکھا۔ اس کی خواہشات اور آرزوؤں کا خون تو نہیں کیا ہے؟ رما کو قلبی سکون کے لیے اب اتنا ہی کافی تھا۔

ابھی گاڑی کو چلے دس منٹ بھی نہ ہوئے تھے کہ گاڑی کا دروازہ کھلا اور ٹکٹ چیکر اندر آیا۔

رما کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ ایک لمحہ میں اس کے پاس آ جائے

گا۔ اتنے آدمیوں کے سامنے اسے کتنا شرمندہ ہونا پڑے گا۔ اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ جیسے جیسے ٹکٹ بابو اس کے قریب آتا تھا، اس کی سانسوں کی رفتار تیز ہوتی جاتی تھی۔ آخر بلا سر پر آ ہی گئی۔ ٹکٹ چیکر نے پوچھا ''آپ کا ٹکٹ؟''

رما نے ذرا سنبھل کر کہا۔ ''میرا ٹکٹ تو قلی کے پاس ہی رہ گیا۔ اسے ٹکٹ لانے کے لیے روپے دیئے تھے، نہ جانے کدھر نکل گیا۔''

ٹکٹ چیکر کو یقین نہ آیا۔ بولا:

''میں کچھ نہیں جانتا۔ آپ کو اگلے سٹیشن پر اترنا ہوگا۔ آپ کہاں جا رہے ہیں؟''

رما: ''سفر تو بڑی دور کا ہے، کلکتہ تک جانا ہے۔''

ٹکٹ چیکر: ''آگے کے سٹیشن پر ٹکٹ لیجیے۔''

رما: ''یہی مشکل ہے میرے پاس پچاس کا نوٹ تھا، کھڑکی پر بڑی بھیڑ تھی۔ میں نے نوٹ اس قلی کو ٹکٹ لانے کے لیے دیا، لیکن وہ ایسا غائب ہوا کہ لوٹا ہی نہیں۔ شاید آپ اسے پہچانتے ہوں۔ وہ قلیوں کا جمعدار ہے۔ لمبا لمبا چیچک رو آدمی ہے۔''

ٹکٹ چیکر: ''اس سلسلے میں آپ لکھا پڑھی کر سکتے ہیں۔ مگر بلا ٹکٹ جا نہیں سکتے۔''

رما نے بڑے ادب اور ملتجی انداز میں کہا۔ ''بھائی صاحب! آپ سے کیا چھپانا، میرے پاس اور روپے نہیں ہیں۔ آپ جیسا مناسب سمجھیں، کریں۔''

ٹکٹ چیکر: ''مجھے افسوس ہے۔ میں قانون و قاعدے سے مجبور ہوں۔''

ڈبے کے سارے مسافر آپس میں کانا پھوسی کرنے لگے۔ تیسرا درجہ تھا، زیادہ تر مزدور بیٹھے ہوئے تھے، جو مزدوری کی تلاش میں پورب جا رہے تھے۔ وہ ایک بابو کو ٹکٹ چیکر کے ہاتھوں ذلیل ہوتے دیکھ رہے تھے۔

شاید رما کو ٹکٹ چیکر نے دھکے دے کر اتار دیا ہوتا تو اور بھی خوش ہوتے۔ رما کو زندگی میں کبھی بھی اتنی شرمندگی نہ ہوئی تھی۔ چپ چاپ سر جھکائے کھڑا تھا۔ ابھی تو اس زندگی کے سفر کی ابتدا ہے۔ نہ جانے آگے کیا کیا مصیبتیں برداشت کرنا ہوں گی۔ کس کس کے ہاتھوں دھوکا کھانا پڑے گا۔ اس کے جی میں آیا کہ گاڑی سے کود پڑے۔ اس جھنجٹ سے تو مر جانا ہی اچھا ہے۔

اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے کھڑکی سے سر باہر نکال لیا اور رونے لگا۔

یکا یک ایک بوڑھے آدمی نے، جو اس کے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا، پوچھا۔

''کلکتہ میں کہاں جاؤ گے بابو جی؟''

رما نے سمجھا، یہ گنوار مجھے بنا رہا ہے۔ جھنجلا کر بولا۔ ''تم سے مطلب؟ میں کہیں بھی جاؤں؟''

بوڑھے نے اس کے اس رویہ پر دھیان نہیں دیا اور بولا: ''میں بھی وہیں چلوں گا۔ ہمارا تمہارا ساتھ ہو جائے گا۔'' پھر آہستہ سے بولا۔ ''کرائے کے روپے مجھ سے لے لو۔ پھر وہاں دے دینا۔''

اب رما کو اس پر کچھ اعتبار آیا۔ اس کی طرف غور سے دیکھا۔ کوئی ساٹھ ستر سال کا بوڑھا کھلا ہوا آدمی تھا۔ گوشت تو کیا، ہڈیاں تک گل گئی تھیں۔ مونچھ اور سر